

ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی

ڈاکٹر جمیل جالبی کے تحقیقی سروکار

Research work of Dr. Jameel Jalibi

By Dr. Abdur Razzaque Ziyadi, Project fellow, Department of Urdu, Jawahir Lal Nehru University, New Delhi, India.

ABSTRACT

The literal meanings of Research are Search and retrieval of facts. There is a strong tradition of research or Literary research in Urdu. Although its earliest traces are found in ancient Urdu poets and Sir Syed, Hali, Shibli and some of their contemporaries are recognized among its founders, but in the real sense, its rise and evolution dates back to the twentieth century. On the contrary, in the twentieth century, it was given the status of a unique field of knowledge and rules and regulations were laid down for it. Among the scholars of this era, the names of Moulvi Abdul Haq, Hafiz and Jameel Jalibi etc. are noteworthy.

Jamil Jalibi's name is important in the history of Urdu literary in many ways. In addition to research, criticism, translation, linguistics, lexicography, terminology, he has a strong reputation in many fields of knowledge and literature and his achievements in every field are very important and significant. But even in all of them, his research status is more important and valuable.

The credit for elevating Jalibi to this position goes to his own determination, hard work and perseverance.

Keywords: Research, Jameel Jalibi, Sir Syed, Hali, Shibli, Linguistics, Lexicography

تحقیق عربی الاصل لفظ ہے اور اس کے لفظی معنی حقیقت کی تلاش یا حقائق کی بازیافت کے ہیں۔ لیکن

پروجیکٹ فیلو، شعبہ اردو، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، ہندوستان

اصطلاح ادب میں اس کا اطلاق صرف ان تحریروں پر ہوتا ہے جن میں کسی خاص موضوع یا مسئلے پر اس کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی فیصلہ کن رائے دی جاتی ہے اور پھر اس کی مدد سے قاری کے لیے اس کی اصل تک پہنچنا ممکن ہو پاتا ہے۔ دیگر اصناف ادب کی طرح ماہرین علم و فن نے اپنے اپنے اعتبار سے اس کی بھی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ مثلاً بقول مالک رام تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ہے ح ق ق، جس کے معنی ہیں کھرے کھوٹے کی چھان بین یا کسی بات کی تصدیق کرنا۔ دوسرے لفظوں میں تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے علم و ادب میں کھرے کو کھوٹے سے، مغز کو چھلکے سے، حق کو باطل سے الگ کریں۔ انگریزی لفظ ریسرچ کے بھی یہی معنی اور مقاصد ہیں۔^(۱)

اسی طرح جمیل جالبی تحقیق کے اغراض و مقاصد، دائرہ کار، نوعیت اور اس سے برآمد ہونے والے نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تحقیق کے معنی ہیں کسی مسئلے یا کسی بات کی کھوج لگا کر اس طور پر اس کی تہ تک پہنچنا کہ وہ مسئلہ یا وہ بات اصل شکل اور حقیقی روپ میں پوری طرح سامنے آجائے۔ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اصل بات یا مسئلہ کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ایسا کیوں ہے۔ تحقیق خواہ ادب یا سائنس کی ہو یا زندگی کے کسی بھی شعبے کی، اس کی نوعیت اور اس کی منزل یہی ہوتی ہے۔ تحقیق کا کام سچ کو جھوٹ سے، صحیح کو غلط سے الگ کر کے اصل حقیقت کو دریافت کرنا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ تحقیق کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد جو رائے قائم کی جائے یا جو لائحہ عمل مقرر کیا جائے گا وہ بھی صحیح و درست ہوگا۔^(۲)

مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہو گیا کہ تحقیق دراصل کسی شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کا نام ہے یا پھر دوسرے لفظوں میں ہم اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی واقعے یا شے کے بارے میں ہم نے پہلے سے جو کچھ سن رکھا ہے یا اس کے بارے میں پڑھ رکھا ہے اس کو جانچنے اور پرکھنے کے بعد ایک نتیجے پر پہنچنا ہی دراصل تحقیق یا ریسرچ ہے۔ اس کا دائرہ صرف ادب اور آرٹ تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں دیگر علوم و فنون اور سائنس بھی شامل ہیں۔

اردو میں تحقیق یا ادبی تحقیق کی ایک باقاعدہ اور مستحکم روایت موجود ہے۔ گرچہ اس کے ابتدائی نقوش تنقید، تاریخ اور سوانح عمری کی طرح شعرائے اردو کے قدیم تذکروں سے ہی ملنے شروع ہو جاتے ہیں مگر حقیقی معنی میں

اس کے بنیاد گزار سرسید، حالی، شبلی اور ان کے بعض معاصرین ہیں۔ اردو میں تحقیق کے عروج وارتقا کا زمانہ بیسویں صدی ہے بلکہ اسی صدی میں اس کو ایک منفرد شعبہ علم کا درجہ ملا اور اس کے لیے اصول و ضوابط بھی منضبط ہوئے۔ حالاں کہ اس سے قبل تحقیق و تنقید نہ صرف ایک ہی سکے کے دو پہلو تصور کیے جاتے تھے بلکہ سرسید، حالی، شبلی اور آزاد جیسے اہم مصنفین کی تصنیفات کا مقصد بھی امر واقعہ کی تحقیق ہی تھا۔ مگر بعد میں جب تحقیق اور تنقید دو الگ الگ خانوں میں بٹ گئے اور دونوں کے لیے علاحدہ علاحدہ اصول و ضوابط بھی وضع کیے گئے تو خود وہ کتابیں بھی تحقیقی سے تنقیدی ہو گئیں جن کی اساس تحقیق پر تھی اور ان کے مصنفین کو محققین کے بجائے ناقدین کہا جانے لگا۔ یہ سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر تک جاری و ساری رہا۔ جب بیسویں صدی کا آغاز ہوا اور کچھ خاص اصول و ضوابط کے ساتھ تحقیق کو باقاعدہ ایک شعبہ علم کی حیثیت حاصل ہوئی تو ناقدین و مصنفین کی ایک بڑی تعداد نہ صرف تحقیق کی جانب متوجہ ہوئی بلکہ اس نے اسی کو اپنی جولان گاہ بھی بنایا اور بہت سے غیر معمولی تحقیقی کارنامے بھی انجام دیے۔ ان محققین و مصنفین میں بطور خاص جن کا نام لیا جاسکتا ہے ان میں مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، مسعود حسن رضوی ادیب، نصیر الدین ہاشمی، محی الدین قادری زور، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، عبدالستار صدیقی، مختار الدین احمد، مالک رام، رشید حسن خاں، گیان چند جین، نذیر احمد، عابد رضا بیدار، تنویر احمد علوی، ثار احمد فاروقی، محمد حسن، مشفق خواجہ، انصار اللہ نظر، حنیف نقوی، خلیق انجم، سیدہ جعفر اور جمیل جالبی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جمیل جالبی کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسے محقق، ناقد، مترجم اور دانشور کا تصور ابھرتا ہے جس کے کارنامے مختلف علوم و فنون اور شعبہ ہائے علم و ادب میں بکھرے پڑے ہیں۔ تحقیق ہو یا تنقید، ترجمہ نگاری ہو یا لسانیات، قالموس سازی ہو یا اصطلاحات سازی یا پھر کوئی اور شعبہ علم و فن ہر ایک میں جمیل جالبی کے کارنامے نہ صرف بڑے اہم اور وسیع ہیں بلکہ ان کا دائرہ بھی کافی وسیع ہے۔ جمیل جالبی کا یہ کمال ہی ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔ مگر ان کے ان تمام کارناموں میں تحقیقی کارنامے اور تمام حیثیتوں میں تحقیقی حیثیت سب سے زیادہ اہم اور مہتمم بالشان ہے۔ بلکہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے ان کی جو بھی تحقیقی خدمات ہیں وہ اس قدر وسیع اور غیر معمولی ہیں کہ ان کی بدولت اردو تحقیق میں بھی ان کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے اور بقول انور سدید ”وہ اس مقام امتیاز پر نہ صرف عرصے تک فائز رہیں گے بلکہ اردو ادب کے ہر تذکرے میں ان کا نام بھی سربرآوردہ محققوں کے ساتھ زندہ رہے گا۔“ (۳)

جمیل جالبی کے ادبی سفر کا آغاز مضمون نگاری اور ترجمہ نگاری سے ہوتا ہے۔ لیکن تخلیق و ترجمہ کے ساتھ

ابتدائی عمر سے ہی ان کا رجحان تحقیق و تنقید کی طرف بھی تھا۔ پھر بعد میں انھوں نے نہ صرف تحقیق کو اپنا محبوب میدان بنا لیا بلکہ خود کو اس کے لیے وقف بھی کر دیا۔ آج سے نصف صدی قبل جب انھوں نے میدان تحقیق میں قدم رکھا تو اس وقت مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسے نامور مصنفین اور صف اول کے محققین اردو تحقیق کے افق پر درخشاں ستاروں کے مانند چمک رہے تھے اور جہاں ایک طرف تحقیق میں دکن، پنجاب اور دبستانِ دہلی کے خدوخال نمایاں ہو رہے تھے وہیں دوسری طرف تحقیق اور تدوینِ متن کے نئے نئے اصول و ضوابط بھی مرتب ہو رہے تھے۔ ایسے میں جمیل جالبی کا تحقیق کے میدان میں قدم رکھنا اور اپنی شناخت قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مگر باوجود اس کے انھوں نے پورے عزم و استقلال کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھا اور ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو نہ صرف ان کے لیے باعثِ شناخت بنے بلکہ خود میدانِ تحقیق کے آفتاب و ماہتاب نے بھی ان کو جھک کے سلام کیا اور آج پوری علمی و ادبی دنیا ان کے ان کارناموں کو حد درجہ عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔

تحقیقی میدان میں جمیل جالبی کو اس مقام و مرتبے پر فائز کرنے کا سہرا خود ان کے عزم و استقلال، محنت، لگن اور جہدِ مسلسل کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بیش بہا اوقات اور اپنی عمر عزیز کا ایک لمبا عرصہ اردو زبان و ادب کی تلاش و تحقیق اور اس کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں لگا دیا۔ جمیل جالبی نے جب میدانِ تحقیق میں قدم رکھا تو اس وقت تحقیق کے جو اصول و ضوابط، طریق کار اور موضوعات و مسائل تھے ان پر ہی انھوں نے اکتفا نہیں کیا بلکہ یہاں پر بھی اپنی تلاش و تحقیق اور تجربات و بازیافت کا سلسلہ جاری رکھا۔ نیز انھوں نے خود اپنے عہد کے اہل علم کے کارناموں کو بھی من و عن نہ قبول کرتے ہوئے ان کو رد و قبول کی سطح پر مختلف اصول و ضوابط کی کسوٹی پر پرکھا اور ان پر تحقیقی و تنقیدی رائے کا اظہار بھی کیا۔ پھر بعد میں انھیں مطالعات کی روشنی میں انھوں نے اپنے لیے تحقیق کے میدان میں انفرادیت کی راہ بھی متعین کی۔ ڈاکٹر گوہر نوشا ہی رقم طراز ہیں:

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان تمام اہل علم کے کام بطور نمونہ سامنے رکھا اور ان کے وضع کیے ہوئے رہنما اصولوں کو رد و قبول کرنے کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنے لیے نہ صرف انفرادی راستہ متعین کیا بلکہ منزل اور ہدف کا بھی تعین کرنے کی کوشش کی۔ میانہ روی اختیار کرتے ہوئے نہ صرف افراط و تفریط سے اجتناب کیا بلکہ پائے ثبات میں بھی لغزش نہ آنے دی۔ بطور کلی دیکھا جائے تو ان کی تحقیق اپنے موضوع کے تنوع کے باوجود انفرادی مطالعے سے اجتماعی مطالعے کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی

ہے۔ میری ذاتی رائے کے مطابق وہ اپنے طریق کار میں پنجاب کے دبستان تحقیق سے زیادہ قریب ہیں۔ وہ دبستان تحقیق جس کے سرخیل حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر پروفیسر محمد اقبال اور ڈاکٹر سید عبداللہ تھے اور جس کے حلقہء اثر میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، مالک رام، ڈاکٹر وحید قریشی، مشفق خواجہ اور خود ڈاکٹر جمیل جالبی شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ادبی تحقیق میں اس سارے گروہ سے اپنی انفرادیت جس پہلو سے قائم رکھی وہ ان کے ہاں موضوعات کا انتخاب ہے۔ جالبی صاحب نے انفرادی تحقیق کے لیے عموماً جن موضوعات کو چنا وہ بے حد منفرد اور مشکل ہونے کے سبب نہ صرف ان کے لیے چیلنج بنے بلکہ ان سے عہدہ برآ ہونا ایک لحاظ سے ان کی پختہ کاری کی علامت بھی بن گیا۔^(۴)

گوہر نوشاہی کے اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جمیل جالبی نے اپنے عہد کے تحقیقی کارناموں سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ وہ ان کے لیے تحقیق کے میدان میں انفرادی راہ متعین کرنے میں معاون و مددگار بھی ثابت ہوئے۔ نیز انھوں نے اپنی تحقیقی انفرادیت کی اساس موضوعات کے انتخاب پر رکھی۔ ان موضوعات میں نئے نئے مواد کی دریافت، دریافت شدہ متن کی تصحیح اور جانچ پرکھ اور مصنف کی شخصیت کا تعین یعنی سوانحی تفصیلات کی فراہمی وغیرہ ان کے یہاں اہم قرار پائے۔ ان موضوعات و مسائل کی تلاش و تحقیق اور ان کی بازیافت میں جمیل جالبی نے برسوں تک شبانہ روز محنت و جاں سوزی سے کام لیا اور ایک تحقیق کار کے لیے بنائے ہوئے حافظ محمود شیرانی کے اصولوں میں حزم و احتیاط، تفحص و تلاش، محنت و عرق ریزی اور وابستگی و انہماک وغیرہ کو اپنے لیے زاد راہ بنائے رکھا۔ انھیں کاوشوں کے نتیجے میں ان کے وہ کارنامے سامنے آئے جو آگے چل کر مرجع و مصدر ثابت ہوئے۔ جمیل جالبی کے تحقیقی کارناموں میں 'تاریخ ادب اردو' کی ترتیب و تصنیف کے ساتھ ساتھ دیوان حسن شوقی، دیوان نصرتی، اور 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' کی ترتیب و تدوین بھی اہم ہیں اور ان میں سے بیشتر کا تعلق دکنیات سے ہے۔

یوں تو اردو زبان و ادب کا ایک بڑا سرمایہ دکنیات پر مشتمل ہے اور ہر عہد میں اس سے متعلق نئی نئی تحقیقات بھی سامنے آتی رہی ہیں۔ مگر باوجود اس کے وہ ایک زمانے تک محققین کی توجہ خاص سے محروم رہا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں پہلی بار اس جانب توجہ دی گئی اور نہ صرف اردو ادب کے بہت سے نادر و نایاب شہ پارے تلاش و تحقیق کے بعد سامنے آئے بلکہ اردو ادب کی تاریخ نگاری میں بھی کئی بڑی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ دکنی ادب کی

تحقیق و تلاش کرنے والے محققین میں مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور، حکیم شمس اللہ قادری، عبدالقادر سروری، نصیر الدین ہاشمی، سید محمد میر سعادت علی رضوی، عبدالمجید صدیقی، سیدہ جعفر، محمد علی اثر اور جمیل جالبی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ ان محققین کے زیادہ تر کارنامے جمع و ترتیب اور تدوین متن سے متعلق ہیں مگر پھر بھی ان کی تحقیقی حیثیت کوئی کم نہیں بلکہ اسی کی بدولت بہت سے قدیم ادب محفوظ کر لیا گیا۔ دکنی ادب کی تحقیق و تدوین کا فریضہ انجام دینے والے بیشتر مصنفین یا تو خود دکن کے تھے یا پھر ان کا تعلق کسی نہ کسی طور پر حیدرآباد یا جامعہ عثمانیہ سے رہا تھا۔ مگر دکن سے دور یعنی شمال میں رہ کر جن لوگوں نے دکنی ادب کی ترتیب و تدوین یا اس کی تحقیق کا مرحلہ سر کرنے کی سعی کی ان میں جمیل جالبی کا نام سرفہرست ہے۔ کیوں کہ انھوں نے دکن سے دور رہ کر وہ کار نمایاں انجام دیے جو خود اہل دکن اور یہاں کے محققین کے لیے راستے کا پتھر بنے ہوئے تھے۔ ذیل میں جمیل جالبی کی ان تحقیقی خدمات یعنی دیوان حسن شوقی، دیوان نصرتی اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی ترتیب و تدوین اور تاریخ و ادب اردو کی ترتیب و تصنیف کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

دیوان حسن شوقی

’دیوان حسن شوقی‘ کی ترتیب و تدوین جمیل جالبی کا پہلا تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ جمیل جالبی نے اسے انجمن ترقی اردو کراچی کی بعض اہم بیاضوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مبسوط مقدمے اور ضروری فرہنگ و حواشی کے ساتھ پہلی بار ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ اس سے قبل نہ شوقی کی غزلیات منضبط تھیں اور نہ ہی اس کے دیوان کا کوئی مخطوطہ کسی کتب خانے کے ذخیرہ کتب میں نگاہ سے گزرا تھا۔ جالبی صاحب نے مختلف بیاضوں سے، جن کا کافی ذخیرہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے، ایک ایک غزل بلکہ ایک ایک شعر حاصل کر کے ۳۱ سالم غزلیں، دو مثنویاں ’فتح نامہ نظام شاہ‘ اور ’میز بانی نامہ‘ اور ایک نظم دیوان شوقی میں جمع کر دی ہے۔ اگرچہ اس سے قبل باباے اردو مولوی عبدالحق شوقی کی دو مثنویاں اور تین غزلیں اور پھر بعد میں مولوی سخاوت مرزا اور حسینی شاہد کی کاوشوں سے آٹھ غزلیں سامنے آچکی تھیں مگر ان سے بھی حسن شوقی کی وہ شناخت سامنے نہ آسکی تھی جو جمیل جالبی کی محنت شاقہ اور مسلسل کاوشوں کی بدولت منظر عام پر آئی۔ جمیل جالبی نے محض کلام حسن شوقی کو، جو کہ مختلف بیاضوں میں بکھرا پڑا تھا، یکجا کرنے کے لیے اپنی زندگی کے دو قیمتی سال انجمن ترقی اردو، کراچی کے کتب خانہ خاص میں صرف کر دیے۔ اس دیدہ ریزی اور جاں سوزی کے ساتھ انھوں نے اس کو ترتیب دیا اور ایک طویل مقدمے کے ساتھ کتابی شکل میں شائع بھی کیا۔

’دیوان حسن شوقی‘ میں شامل جمیل جالبی کا مقدمہ کافی مطول و مبسوط اور عالمانہ ہے۔ یہ مقدمہ کوئی ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جمیل جالبی نے وہ تمام معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے جو انھیں حسن شوقی سے متعلق فراہم ہوئی تھیں۔ حسن شوقی کی پیدائش کب ہوئی، اس نے اپنی زندگی کس ڈھب سے گزاری اور اس کا انتقال کب اور کہاں ہوا ان تمام کے بارے میں اگرچہ اس میں بہت زیادہ معلومات نہیں مگر اس کی شاعری، اس کے عہد کے بادشاہوں اور ان کے حالات زندگی پر بات تفصیل گفتگو موجود ہے۔ اسی طرح مقدمے میں حسن شوقی کی مثنویوں، غزلوں اور دیگر کلام پر جالبی کا تبصرہ اور تجزیہ حد درجہ قابل تحسین اور کارآمد ہے۔

دیوان حسن شوقی کی ترتیب و تدوین میں جمیل جالبی نے جہاں اپنے پیش رو محققین کی تحقیقات سے اخذ و استفادہ کیا ہے وہیں قدم قدم پر انھوں نے ان سے اختلافات بھی روار کھے ہیں۔ مثلاً مثنوی ’فتح نامہ نظام شاہ‘ کی ترتیب کے وقت جمیل جالبی کے پاس اس کے دو نسخے تھے۔ اس سے قبل ان پر مولوی عبدالحق اپنی رائے دے چکے تھے اور ان کے نزدیک نسخہ اول درست تھا جبکہ نسخہ ثانی کے اشعار کو انھوں نے الحاقی قرار دیا تھا۔ لیکن عبدالحق کی اس رائے کے برخلاف جمیل جالبی نسخہ ثانی کو بھی صحیح تسلیم کرتے ہیں اور اپنے اس دعوے کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے شاعر کی نامکمل مثنوی تکمیل کو پہنچتی ہے۔ جمیل جالبی نے پہلی بار بڑی محنت اور چھان بین کے بعد مثنوی ’فتح نامہ نظام شاہ‘ کے دونوں نسخوں کے اشعار کو سمیٹ کر انھیں ان کی جگہ پر رکھا اور اُسے اس کی مکمل شکل دی۔

اسی طرح اس دیوان میں حسن شوقی کی دوسری مثنوی ’میز بانی نامہ‘ ہے۔ فتح نامہ نظام شاہ کے مقابلے میں یہ مثنوی فکری و فنی اعتبار سے نہ صرف زیادہ اہم ہے بلکہ اس میں شوقی کا اسلوب سخن بھی زیادہ نکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ-۱۰۶۸ھ) کی شادی کا ذکر بڑی خوب صورتی سے بیان ہوا ہے۔ لیکن اس کی شادی کس خاتون سے ہوتی ہے اس میں اس کا ذکر موجود نہیں۔ لہذا اس خاتون کے تعلق سے محققین دو خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی اور حسینی وغیرہ کے نزدیک سلطان کی شادی وزیر اعظم کی صاحبزادی کے ساتھ ہوتی ہے جبکہ اس کے برخلاف جمیل جالبی کے خیال میں سلطان محمد عادل شاہ کی شادی نواب مظفر علی خاں کی بیٹی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے ایسی دلیلیں پیش کی ہیں جن سے انکار کی کسی کے پاس کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ مثلاً اپنی اس بات کی تائید میں انھوں نے خود میز بانی نامہ سے یہ اقتباس نقل کیا ہے کہ ”در بیان مہمانی کردن سلطان محمد عادل شاہ را و دادن حمیز دختر نواب مظفر خاں“۔ یقیناً جالبی صاحب کی یہ دلیل نہ صرف قاری کو اپنا قائل بنا لیتی ہے بلکہ اس سے ماقبل محققین کی مکمل

تردید بھی ہو جاتی ہے۔

”دیوان حسن شوقی“ کی تحقیق و تلاش اور ترتیب و تدوین کے ضمن میں جمیل جالبی کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ انھوں نے شوقی کے ساتھ ساتھ اس عہد کے کچھ اور دیگر شعرا کو بھی ڈھونڈ نکالا ہے جو یا تو پردہ خفا میں تھے یا قدیم شعری روایت کی تعمیر و تنظیم میں ابھی ان کو کوئی موزوں مقام نہیں مل سکا تھا۔ ان شعرا میں محمود، فیروز، اشرف، تائب، رحیمی، قریشی اور یوسف وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس تعلق سے جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ خود حسن شوقی نے اپنے اشعار میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے ان شعرا سے نہ صرف کسب فیض کیا تھا اور ان کے مزاج کو اپنایا تھا بلکہ ان کے رنگ میں غزلیں بھی کہی تھیں۔

”دیوان حسن شوقی“ کی ترتیب و اشاعت سے ادبی تحقیق کے سرمائے میں جہاں ایک گراں قدر اضافہ ہوا وہیں اس سے ادب کی تاریخی حیثیت میں بھی ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کے ذریعے جمیل جالبی نے دکن میں اردو کی شعری روایت میں رائج اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا ہے جس کے تحت ایک زمانے تک نصرتی اور ولی کو دو علاحدہ علاحدہ روایتوں کا پاس دار سمجھا جا رہا تھا۔ اس کے ذریعے جمیل جالبی نے نہ صرف اس رشتے کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے جو انھیں ایک ہی روایت کا پاس دار بنائے بلکہ اس درمیانی کڑی کو بھی ڈھونڈ نکالا ہے جو اس سلسلے کو ٹوٹنے سے بچاتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

کتاب کا دیباچہ اس نئی دریافت کی لسانی اور ادبی حیثیت متعین ہی نہیں کرتا بلکہ تاریخ ادب میں دکنی روایت کی کڑیاں بھی اردو شاعری کے بعد کے ادوار سے ملاتا ہے۔ نصرتی سے لے کر ولی تک شاعری کی جو روایت پروان چڑھی ہے اس کے بارے میں نقادوں میں خاصی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ولی کو عموماً اس حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ایک صبح بیدار ہوئے اور انھوں نے طے کیا کہ آئندہ سے فارسی اثرات کو قبول کرتے ہوئے شعر کہا کریں گے۔ جالبی صاحب ولی کو دکنی روایت سے الگ کر کے دیکھنے کے قائل نہیں، انھوں نے نصرتی سے لے کر ولی تک کی دکنی شاعری میں جس طرح فارسی روایت کے انجذاب کا عمل ہوتا رہا ہے اس کا سراغ لگا کر ادبی روایت کے تسلسل کی نشان دہی کی ہے۔ اسی اعتبار سے وہ حسن شوقی کے کلام کو ایسا ”درمیانی پل“ قرار دیتے ہیں جس کے بغیر روایت تک نہیں پہنچا جاسکتا۔^(۵)

جمیل جالبی نے اس کے لیے بطور ثبوت دیوان حسن شوقی سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اس کا انداز سخن اور رنگ سخن اسی طرح پرکشش اور حسین ہے جس طرح کہ اس سے قبل نصرتی کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والے شعرا نے اس کی پیروی کی اور اس کی زمینوں میں اپنی غزلیں بھی کہیں۔ اس طرح حسن شوقی کی بدولت شعری روایت کا وہ تسلسل جو نصرتی سے چلا آ رہا تھا وہ ولی دکنی تک آپہنچتا ہے۔ اگر درمیان میں حسن شوقی نہ ہوتا تو شاید یہ سلسلہ بھی ٹوٹ جاتا۔ شعری روایت کے اس تسلسل کے علاوہ اس کے ذریعے جمیل جالبی نے کچھ اور بھی نتائج اخذ کیے ہیں۔ ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱) جیسے دسویں صدی ہجری کی قدیم غزل پر محمود، فیروز اور خیالی کا سایہ پڑتا نظر آتا ہے، اسی طرح نصف سے زیادہ گیارہویں صدی ہجری تک حسن شوقی کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے اور پھر یہ اپنا رنگ دوسرے رنگوں میں ملا کر خود ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔^(۶)

(۲) حسن شوقی کی زبان اس زمانے کے دکن کی عام بول چال کی زبان ہے۔ اس میں ان تمام بولیوں اور زبانوں کے اثرات کی ایک کچڑی سی پکتی دکھائی دیتی ہے جو آئندہ زمانے میں ایک جان ہو کر اردو کی معیاری شکل متعین کرتے ہیں۔ زبان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اپنے ارتقا کی اس ترکیبی منزل میں ہے جہاں سے اردو حروف علت کا موجودہ نظام پروان چڑھنے لگا۔ اس کی سب سے واضح شکل صیغہ ماضی کے افعال میں ملتی ہے۔^(۷)

اس طرح دیوان حسن شوقی کی تدوین و اشاعت سے جہاں اردو کے ادبی سرمائے میں ایک بڑا اضافہ ہوا وہیں اس کی بدولت ادبی تاریخ سے متعلق بہت سی ان غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہوا جو سالہا سال سے چلی آرہی تھیں۔ نیز اسی کے ذریعے ہمیں اس بات کا بھی علم ہوا کہ حسن شوقی اردو کا وہ غیر معمولی شاعر ہے جس کی شاعری کے اثرات اردو کی شعری روایت پر بہت دور پاؤں دیر پا مرتب ہوئے اور ولی جیسے عظیم و مستند شاعر نے بھی اس سے اثرات قبول کیے اور خود کو اس کا مقلد ٹھہرایا:

برجا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے دجے بار
رکھ شوق میرے شعر کا شوق حسن آوے

دیوانِ نصرتی

’دیوانِ حسن شوقی‘ کی تلاش و تحقیق کے بعد جمیل جالبی کے تحقیقی کارناموں میں ’دیوانِ نصرتی‘ کی ترتیب و تدوین قابل ذکر ہے۔ جمیل جالبی نے اسے مرتب کر کے پہلی بار ۱۹۷۲ء میں مطبع قوسین لاہور سے شائع کیا۔ نصرتی دکن کے ان شعرا میں سے ایک ہے جس کی شعری حیثیت ہر عہد میں مسلم رہی۔ خود وہ اپنے دور کا معروف و ممتاز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ دربار بیجاپور کا ملک الشعرا بھی تھا۔ لیکن باوجود اس کے ابھی تک اس کا پورا کلام منظرِ عام پر نہیں آسکا تھا۔ اس کی دو مثنویاں ’علی نامہ‘ اور ’گلشنِ عشق‘ ہی لوگوں میں معروف تھیں اور انھی کے بدولت لوگ اسے ایک باکمال شاعر کے طور پر جانتے تھے۔ ان دو مثنویوں کے علاوہ نصرتی کا بقیہ کلام گوشہ گم نامی میں مدفون تھا مگر جمیل جالبی نے انھیں بڑی محنت و لگن اور تلاش و جستجو کے بعد دریافت کیا اور اسے منظرِ عام پر لائے۔ جمیل جالبی کلامِ نصرتی کی ترتیب و تدوین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”تاریخِ ادبِ اردو“ پرتن تھا کام کرتے ہوئے جب میں سینکڑوں بیاضوں اور مخطوطات کے جنگل سے گزرا تو مجھے اکثر ملا نصرتی کا کلام بھی ملتا رہا جسے میں دوسرے شعرا کے نایاب کلام کی طرح جمع کرتا رہا۔ ”تاریخِ ادبِ اردو“ میں نصرتی پر لکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ریزہ ریزہ کر کے میرے پاس نصرتی کا اتنا کلام جمع ہو گیا ہے کہ اب نصرتی اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہے۔ نصرتی کا یہی وہ نادر و نایاب کلام ہے جسے ترتیب دے کر اب دیوانِ نصرتی کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔^(۸)

اس طرح جمیل جالبی نے نصرتی کے کلام ریزہ ریزہ کو یکجا کر کے شائع کیا۔ اس دیوان میں ایک مبسوط و مطول مقدمہ کے علاوہ تاریخِ اسکندری، بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس میں قصیدہ ’چرخِ گھوڑا مانگنے کی درخواست بادشاہ سے‘، پھر ایک اور قصیدہ، ایک ہجو، ۲۳ غزلیں، ۲۸ رباعیاں، ۳ قطعات، ۲ مخمسے اور آخر میں ایک فارسی غزل:

ز پنچہ من چاک گریباں گلہ دارد
از گریہ من گوشہ دامان گلہ دارد

بھی شامل ہے۔ نیز ان تمام کے آخر میں بارہ صفحات پر مشتمل فرہنگِ دیوانِ نصرتی بھی موجود ہے۔ دیوانِ نصرتی میں شامل جمیل جالبی کا مقدمہ بے حد اہم اور معلومات افزا ہے۔ اس میں جہاں نصرتی کے کلام اور بالخصوص اس

کی غزل گوئی پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے وہیں اس کی زندگی کے بہت سے اہم گوشوں مثلاً اس کی تصانیف، آبا و اجداد، سنین پیدائش و وفات سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں نمونہ کلام اور شاعری پر تنقیدی بحث بھی موجود ہے۔ حالاں کہ جمیل جالبی کی اس تحقیق سے قبل نصرتی کے بارے بہت کم معلومات دستیاب تھیں۔ اگرچہ مولوی عبدالحق اور دیگر محققین کی تحقیقات پہلے سامنے آچکی تھیں مگر ان میں سے بیشتر کا تعلق صرف اس کی دو مثنویوں ”گلشن عشق“ اور ”علی نامہ“ سے ہی تھا۔ محمد علی اثر اپنے ایک مضمون ”ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق“ میں لکھتے ہیں:

”گلشن عشق“ کو مولوی عبدالحق اور سید محمد نے علی الترتیب ۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے اور ۱۹۵۷ء میں سالار جنگ پبلشنگ کمیٹی حیدرآباد نے شائع کیا تھا۔ جب کہ اس کی معرکہ آرا رزمیہ مثنوی ”علی نامہ“ کو عبدالمجید صدیقی نے ۱۹۵۹ء میں مرتب کر کے سالار جنگ پبلشنگ کمیٹی حیدرآباد سے شائع کیا۔ نصرتی کے عنوان سے مولوی عبدالحق کی مرتبہ کتاب ۱۹۴۴ء میں دہلی سے منظر عام پر آئی ہے۔^(۹)

اس طرح نصرتی پر اگرچہ مولوی عبدالحق کی کتاب ۱۹۴۴ء میں ہی منظر عام پر آچکی تھی مگر وہ اس قدر معلومات افزا نہیں تھی کہ وہ اس کی سوانح و شخصیت کو جاننے کے لیے کافی ہوتی۔ جمیل جالبی نے پہلی بار اپنے مقدمے میں نصرتی کو ایک خاص تاریخی پس منظر میں پیش کیا اور اس خلا کو دور کیا جو ایک زمانے سے تاریخ ادب اردو میں چلا آ رہا تھا۔ اس حوالے سے افسر صدیقی امر و ہوی لکھتے ہیں:

مرتب نے نصرتی کا کلام یکجا کرنے سے قبل اس کے سوانح حیات میں نام و نسب ، درباری، اخلاق و عادات ، دوست احباب اور وفات کا قطعہء تاریخ پیش کر کے ایک ایسے باکمال شاعر کے کارناموں کو حیات جاودانی بخشی ہے جن سے تاریخ ادب کے صفحات ابھی تک خالی تھے اور جن کی اشاعت کے بعد وہ خلا پر ہو گیا جو حسن شوقی اور ولی کے درمیان واقع تھا۔^(۱۰)

اس مقدمے میں جمیل جالبی نے نصرتی کے سوانحی کوائف اور حالات زندگی کے علاوہ اس کی مختلف شاعرانہ حیثیتوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ نصرتی کی مشہور مثنویوں گلشن عشق، علی نامہ، تاریخ اسکندری پر بھی ان کی سیر حاصل گفتگو موجود ہے۔ جمیل جالبی نے اپنے اس مقدمے میں نصرتی کے قصائد اور ان کی قصیدہ نگاری پر ایک تحقیق و

تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس سے قبل نصرتی کی شناخت ایک مثنوی گو سے زیادہ نہ تھی مگر جمیل جالبی نے اس کی ایک ایک غزل کو تلاش کر کے اس کی اس حیثیت کو بھی قائم کرنے کی سعی ہے۔ نیز اس میں جالبی صاحب نے نصرتی کے ان اثرات کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو بعد کے شعرا یا شعری روایت پر مرتب ہوئے اور پھر وہ ایک مضبوط و مستحکم شکل میں ولی اورنگ آبادی تک پہنچے۔ چنانچہ غلام مصطفیٰ خاں اپنے ایک مضمون ”تاریخ ادب اردو کا ایک جائزہ“ میں لکھتے ہیں:

نصرتی نے اپنے دور کی شاعری پر دو گہرے اثرات چھوڑے۔ پہلا اثر تو یہ تھا کہ اس نے زبان و بیان پر ایک ایسا معیار قائم کیا جہاں تک دکنی شاعری اب تک نہیں پہنچی دوسرا اثر یہ تھا کہ اس نے ہیئت اور مواد کے گہرے رشتے کو واضح کیا اور اپنی شاعری میں ایک نئے فنی توازن کو قائم کیا۔^(۱۱)

اس طرح ”دیوان نصرتی“ کی ترتیب و تدوین اردو زبان و ادب کے لیے ایک نہایت ہی اہم اور غیر معمولی تحقیقی کارنامہ ثابت ہوئی۔ اگر اس جانب جمیل جالبی نے توجہ نہ کی ہوتی تو شاید ہم اس عظیم خزانہ ادب سے محروم ہو جاتے اور ملا نصرتی جیسا عظیم شاعر، جس کو ملک الشعرا کا خطاب ملا، جس نے بزمیہ و رزمیہ ہر دو قسم کی مثنویاں لکھ کر اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا اور جس کی شعری روایت پر چل کر ولی، دکنی بنا، محض ایک مثنوی گو شاعر کی حیثیت سے تاریخ کا حصہ بن جاتا اور اس کو کبھی بھی وہ مقام و مرتبہ نہ حاصل ہوتا جو ”دیوان نصرتی“ کے منظر عام پر آنے کے بعد اس کے حق میں آیا۔ بلاشبہ اسے جمیل جالبی کی خداداد صلاحیتوں اور ان کی محنت و ریاضت کا نتیجہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو کی سب سے قدیم اور پہلی مثنوی ”کدم راؤ پدم راؤ“ ہے۔ یہ بھی ایک زمانے تک گوشہ گم نامی میں پڑی رہی۔ اس کا منظر عام پر آنے کا قصہ بھی بڑا طویل اور عجیب و غریب ہے۔ مختصر یہ کہ یہ ایک علم دوست اور کتاب فروش کے ہاتھوں مشہور محقق نصیر الدین ہاشمی تک پہنچی۔ انھوں نے اس کا سر سری جائزہ لیا اور اس کا تعارف کراتے ہوئے ایک مختصر مضمون بعنوان ”بہمنی عہد کا ایک دکنی شاعر“ رسالہ ”معارف“، اعظم گڑھ میں اکتوبر ۱۹۳۲ء میں شائع کرایا۔ پھر جب یہ مثنوی مولوی عبدالحق تک پہنچی تو وہ اسے اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر تفصیلی مقدمے کے ساتھ شائع کرانا چاہتے تھے مگر عدیم الفرستی نے ان کو یہ موقع

نہ دیا۔ بعد کے کئی محققین نے بھی اس جانب توجہ دی مگر وہ بھی اس مشکل کام کو کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شاید اس کی وجہ اس میں موجود لسانی مشکل پسندی رہی ہو۔ کیوں کہ اس کی زبان میں اجنبیت کے احساس کے ساتھ ساتھ غیر مانوس عربی و فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال بھی ہے جو کہ شمالی ہند کے محققین و مصنفین کے لیے مشکل کا باعث تو تھا ہی خود اہل دکن کے لیے بھی لوہے کے چنے چبانے سے کم نہ تھا۔ لیکن باوجود اس کے جمیل جالبی نے اس چیلنج کو قبول کیا اور آخر کار ان کی کاوشوں سے مثنوی ”کدم راؤ پدم راؤ“ معرض وجود میں آئی۔ اس کی ترتیب و تدوین کی راہ میں درپیش مسائل و مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

اس مثنوی کو مرتب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایک تو اس کا مخصوص اور نامعین رسم الخط جس میں ایک ہی جیسی آوازوں کے لیے حروف کی مختلف صورتیں استعمال کی گئی تھیں۔ پھر زبان اجنبی، اس حد تک اجنبی کہ بادی النظر میں یہ اردو کی قدیم صورت کی بجائے ایک غیر زبان معلوم ہوتی ہے۔ شعری تصانیف کے متن کی تصحیح میں علم عروض سے بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن زیر نظر مثنوی میں شاہنامہ فردوسی کی معروف بحر کے استعمال کے باوجود متعدد مصرعوں کی صحیح صورت کو سمجھنا خاصا مشکل ہے۔ کیوں کہ بیشتر عربی فارسی الفاظ کا تلفظ وہ نہیں جس سے اہل اردو مانوس ہیں۔ بہر حال ان مشکلات پر قابو پانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ اب اس ہفت خواں کو طے کر لیا گیا ہے اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی کوشش سے یہ مثنوی شائع ہو گئی ہے۔^(۱۲)

چوں کہ جمیل جالبی میں تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ لسانیاتی شعور بھی بدرجہ اتم موجود تھا اور عربی و فارسی کے علاوہ قدیم اردو سے بھی انھوں نے خود کو واقفیت بہم پہنچالی تھی، جیسا کہ قدیم اردو کی لغت اور دکنی و گجراتی ادب پر ان کے بڑے بڑے کارنامے موجود ہیں، اس لیے ان کی اس علمیت و واقفیت کی بدولت ہی یہ مثنوی منظر عام پر آسکی۔

جمیل جالبی نے اپنی جی توڑ کوششوں کے بعد دیوان حسن شوقی اور دیوان نصرتی کی طرح مثنوی ”کدم راؤ پدم راؤ“ کو بھی ایک مفصل مقدمے کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ اس مقدمے میں مثنوی کا زمانہ تصنیف، حالات مصنف، موضوع مثنوی، املا و لسانی خصوصیات پر تفصیلی گفتگو موجود ہے۔ کتاب کے آخر میں جالبی صاحب نے ایک جامع فرہنگ بھی شامل کی ہے جس سے قاری کے لیے مثنوی میں مستعمل دکنی لفظیات کے موجودہ

معانی کی تفہیم میں بڑی سہولت ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ دو ضمیمے بھی شامل کتاب ہیں جن میں سے ایک میں سلاطین بہمنی کا اور دوسرے میں ان شخصیات کا تعارف و احوال موجود ہے جن کا ذکر مثنوی میں آیا ہے۔ مقدمے میں جیسا کہ ابھی اوپر ذکر ہوا، جمیل جالبی نے مثنوی ”کدم راؤ پدم راؤ“ کے زمانہ تصنیف کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی تحقیق کی رو سے یہ مثنوی احمد شاہ ولی بہمنی کے دور حکومت (۸۲۵ھ - ۸۳۹ھ) میں ۸۲۵ھ سے ۸۲۹ھ کے درمیان لکھی گئی۔ اس کے برخلاف نصیر الدین ہاشمی اور کچھ دیگر محققین اس بات کے قائل تو ضرور ہیں کہ یہ مثنوی احمد شاہ کے زمانے میں لکھی گئی مگر ان کے نزدیک اس کا زمانہ تصنیف وہ نہیں ہے جس اوپر ذکر ہوا بلکہ ان کے یہاں یہ مثنوی ۸۶۵ھ سے لے کر ۸۶۷ھ کے درمیان لکھی گئی تھی۔ نصیر الدین ہاشمی کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

اب اس امر کی تحقیق کرنی ہے کہ مثنوی کس سنہ میں لکھی گئی۔ اس کے متعلق ہم کو مثنوی سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی علاء الدین بہمنی کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے۔ اور اس کا ولی عہد احمد تھا۔ خاندان بہمنی کے سلسلے سے واضح ہوتا ہے کہ سوائے گیارہویں حکمران علاء الدین ہمایوں شاہ کے کوئی اور ایسا حکمران نہیں ہوا جس کا لقب علاء الدین ہو اور احمد شاہ اس کے ولی عہد کا نام ہو۔ یہ احمد شاہ ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ تک حکمران رہا ہے اس لیے اس مثنوی کی تصنیف بھی اسی زمانے میں قرار دینی چاہیے۔^(۱۳)

جمیل جالبی نے نصیر الدین ہاشمی کے اس بیان کو سرے سے رد نہیں کیا ہے بلکہ اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے انھوں نے مختلف اشعار کے حوالے پیش کیے ہیں۔ چنانچہ ”تذکرہ سلاطین دکن“ کو سامنے رکھ کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اشعار:

شہنشاہ بڑا شاہ احمد کنوار
پر تپال سنسار کر تار ادھار
دھنی تاج کا کون راجا ابھنگ
کنور شاہ کا شاہ احمد بھنگ
لقب شہ علی آل احمد ولی
ولی تے بہت بدہ تد آگہی

میں جس احمد کا بیان موجود ہے وہ دراصل دو احمد ہیں۔ ایک تو وہ احمد شاہ جو ایک بڑے شہنشاہ کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے اور دوسرے وہ جسے بادشاہ کا کنور کہا گیا ہے اور جس کا لقب احمد ولی بہمنی بتایا گیا ہے۔ گویا احمد شاہ (بڑا شہنشاہ) احمد خاں (ولی بہمنی) کا بیٹا اور علاء الدین حسن بہمنی بانی سلطنت کا پوتا ہے اور یہ مثنوی احمد خاں ولی بہمنی کے عہد میں ہی لکھی گئی جس کا دور حکومت ۸۲۵ھ سے ۸۳۹ھ تک رہتا ہے۔

مقدمے میں سنہ تصنیف کے بعد مثنوی کے مصنف کے حوالے سے تحقیق پیش کی گئی ہے۔ چوں کہ مثنوی کے ابتدائی اور آخری صفحات ندارد ہیں اس لیے اس کے مصنف کے نام کا صحیح علم نہیں ہو پاتا ہے۔ جمیل جالبی کے نزدیک اس کا نام فخر دیں تھا جبکہ مولوی عبدالحق اور دیگر محققین نے اس کا نام فخر الدین بتایا ہے۔ اس حوالے سے جمیل جالبی نے جو تحقیقی نقطہ نظر پیش کیا ہے وہ زیادہ قابل قبول اور نتیجہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ چوں کہ شاعر نے اپنا یہ نام خود بتایا ہے اس لیے اس کو کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی ممکن ہے خواہ وہ قواعد کے اعتبار سے غلط اور موجودہ مروّج ناموں سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ صرف اس کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ پنجاب کے قدیم شعرا کے یہاں بھی اس طرح کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ مثنوی ”کدم راؤ پدم راؤ“ سے یہ اشعار دیکھیے جن میں شاعر نے اپنا نام اور تخلص استعمال کیا ہے:

سنوئے فخر دیں توں بسر آکھیا
محمد نبی خاتم انبیا
نظامی کہنہار جس یار ہو لے
سنہار سن نغز گفتار ہوئے

اسی طرح ”پرت نامہ“ کے مصنف فیروز، جس کا نام قطب دین تھا، اپنے نام کا اظہار ایک شعر میں کچھ اس طرح کرتا ہے:

مجھے ناوں ہے قطب دیں قادری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

مقدمے میں مصنف کے نام کے بعد جمیل جالبی نے اس کے دربار سے وابستگی یا عدم وابستگی، مثنوی کے اوزان و بحر اور اس کی کہانی کا قدیم قصوں سے ماخوذ ہونے یا نہ ہونے پر بھی تحقیقی انداز میں گفتگو کی ہے۔ بلکہ ان میں بھی وہ ان محققین سے دو قدم آگے نکل گئے ہیں جن کی حیثیت ان کے سامنے اگرچہ پیش رو کی تھی مگر وہ تدوین متن اور اس کی جانچ پرکھ میں خود کو کچھ بندھے نکلے اصولوں ہی کا پابند سمجھتے تھے۔ وحید قریشی لکھتے ہیں:

کتاب کا بنیادی حصہ مثنوی کے متن پر مشتمل ہے جس میں اس روایت کی پابندی کی گئی ہے جس کے سرخیل حافظ محمود شیرانی اور آخری اہم رکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ہیں۔ گویا مرتب نے متن کی اس تکنیک کو اختیار نہیں کیا جو دکنیات کے لیے ڈاکٹر زور اور ان کے ساتھیوں نے اختیار کی تھی اور جس میں صرف سیاق عبارت تک اپنے آپ کو محدود رکھا جاتا تھا اور اٹکل سے لفظوں کی شناخت ہوتی تھی۔ انھوں نے قلمی نسخے کے انداز کتابت اور املائی خصوصیات کو سابق عبارت کے ساتھ ملا کر دیکھا ہے اور اپنی مساعی کو امکانی حد تک آگے لے گئے ہیں۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طریق کو ایک ایک شعر پر منطبق کیا ہے۔^(۱۴)

اس طرح جمیل جالبی نے تحقیق اور تدوین متن کے لیے اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق مثنوی ”کدم راؤ پدم راؤ“ کی ترتیب و تدوین کی اور اسے منظر عام پر لا کر ادبی سرمائے میں اضافہ کیا۔ ان کا یہ طریق کار صرف مثنوی ”کدم راؤ پدم راؤ“ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ دیوان حسن شوقی اور دیوان نصرتی کی تلاش و تحقیق اور ترتیب و تدوین میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان تمام کی اشاعت میں جمیل جالبی نے جس قدر اپنے پیش بہا اوقات صرف کیے وہ صرف آپ ہی کر سکتے تھے۔ صرف مثنوی ”کدم راؤ پدم راؤ“ کی تلاش و ترتیب میں ان کی زندگی کے بیش قیمت سات سال لگ گئے۔ یقیناً اس قسم کے تحقیقی کارناموں کے لیے جس قدر تنقیدی شعور، ذوق سلیم، محنت شاقہ اور ذہانت و ذکاوت کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام کی تمام جمیل جالبی کے یہاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

تاریخ ادبِ اردو

جمیل جالبی کی تمام تر تحقیقی کاوشوں میں ’تاریخ ادبِ اردو‘ کو غیر معمولی اہمیت اور مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ اس کی ترتیب و تصنیف میں انھوں نے نہ صرف اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ صرف کر دیا بلکہ اس کو ان کی مطالعاتی زندگی کا نچوڑ کہا جاسکتا ہے۔ یوں تو جمیل جالبی نے اس کے لکھنے کا آغاز ۱۹۶۵ء میں ہی کر دیا تھا مگر زندگی کی دیگر مصروفیات نے انھیں اس قدر گھیر رکھا تھا کہ شبانہ روز محنتوں اور مسلسل کاوشوں کے باوجود بھی وہ اس کام کو اتنی جلدی منظر عام پر نہ لاسکے جتنی جلدی کہ وہ چاہ رہے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں اور دوسری جلد، جو کہ دو حصوں پر مشتمل ہے، ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی اور ابھی کچھ سال پہلے اس کی تیسری اور چوتھی

جلدیں بھی سامنے آئی ہیں جو کہ حد درجہ ضخیم اور بسیط ہیں۔ محض اس کی ابتدائی دو جلدوں کے صفحات کوئی دو ہزار کے قریب ہیں اور ان پر گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارہویں صدی کے آخر تک کی اردو زبان و ادب کی داستان موجود ہے۔ پہلی جلد اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا سے لے کر ولی گجراتی اور ان کے معاصرین کو محیط ہے۔ اس جلد میں جمیل جالبی نے نہ صرف اردو زبان کے آغاز سے بحث کی ہے بلکہ پورے اس عہد کا سیاسی و سماجی، تہذیبی و معاشرتی اور ادبی و لسانی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

جمیل جالبی نے اردو زبان کی تشکیل کے ابتدائی نقوش کا سراغ لگانے کے بعد ادبی روایت کی مختلف کڑیوں کو ملانا اور اس روایت کے پھلنے پھولنے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو ادب مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہوا اور مختلف خطوں میں محصور نظر آتا ہے۔ اس تاریخ میں ادب ایک ایسا دھارا ہے جو بدلتے ہوئے حالات کے تحت کہیں آہستہ خرام ہے اور کہیں تیز رو۔ یہ دھارا خطِ مستقیم کی صورت میں نہیں بلکہ مختلف سمتوں میں بہتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور اس کا تسلسل کہیں ختم نہیں ہوتا۔ اردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے ادبی روایت کے تسلسل کو نظر انداز کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ ہمیشہ پابند مقامات رہی ہے، اور ہر مقام کی ادبی روایات جدا گانہ ہیں، جمیل جالبی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ کو ایک ایسا مجمع الجزائر نہیں سمجھا جس کے جزیرے ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ انھوں نے ادبی روایت کے تسلسل کا سراغ لگایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان اور ادب کی تاریخ جو مسعود سعد سلمان سے شروع ہوتی ہے اور ولی اور ان کے معاصرین تک پہنچتی ہے، ایک مسلسل سفر سے عبارت ہے۔^(۱۵)

مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ جمیل جالبی نے ”تاریخ ادب اردو“ کی جلد اول میں اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا کے بعد مسعود سعد سلمان سے شروع ہو کر ہم تک پہنچنے والے اس ادبی سفر کا، از ابتدا تا ولی اور ان کے معاصرین، مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس مطالعے میں انھوں نے جن اہم مسائل موضوعات پر اپنی تحقیقی نظر ڈالی ہے ان میں امیر خسرو کی خالق باری، مخدوم شاہ حسینی کی معراج العاشقین اور فرخ دیں نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ اس سے قبل ان پر اور اس کے علاوہ کچھ دیگر دکنی و گجراتی اردو ادب کے

مسائل و موضوعات پر مختلف رسائل و جرائد میں تحقیقات سامنے آچکی تھیں یا پھر ان پر کتابیں بھی موجود ہیں مگر ان کی حیثیت وہ نہیں ہے جو جمیل جالبی کی تحقیقات کی بدولت سامنے آئی۔ اس کے علاوہ جمیل جالبی نے اپنی اس تاریخ نگاری میں ماقبل کی تحقیقات کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے اور پہلی بار انھوں نے دکن اور گجرات کے ادب کو تاریخی و سیاسی اور سماجی و ثقافتی پس منظر میں ایک مربوط و مسلسل روداد کی شکل میں پیش کیا ہے۔

”تاریخ ادب اردو“ کی جلد اول کی طرح اس کی دوسری جلد بھی تحقیقی اعتبار سے بے حد اہم اور قابل اعتبار ہے۔ یہ جلد سترھویں صدی عیسوی کی آخری تین چار دہائیوں سے لے کر کم و بیش پوری اٹھارھویں صدی کو محیط ہے۔ اس میں جمیل جالبی نے جعفر زٹلی سے لے کر میر حسن اور ان کے معاصرین تک کا مطالعہ پوری شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جلد اول کی طرح اس میں بھی جمیل جالبی نے بطور تمہید اٹھارھویں صدی کا فکری و سیاسی، تہذیبی و معاشرتی اور ادبی و تہذیبی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اردو شاعری کے افکار و نظریات اور محرکات و میلانات پر جو تحقیقی نکات پیش کیے ہیں وہ حد درجہ اہم اور نتیجہ خیز ہیں۔ بقول مشفق خواجہ:

یہ مباحث اتنے فکر انگیز ہیں کہ قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے موضوع کے کسی پہلو پر سرسری نظر نہیں ڈالی اور وہ اس میں ڈوب کر پاتال تک کی خبر لے آیا ہے۔ جمیل جالبی بعض سامنے کی باتوں پر اچھوتے اور نئے پہلو سے روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً اردو شاعری کے بارے میں یہ بات عموماً کہی جاتی ہے کہ یہ دور زوال کی پیداوار ہے۔ اس سے مراد عموماً یہ ہوتی ہے کہ جو چیز دور زوال کی پیداوار ہوگی وہ زندگی کی بہترین قدروں کی آئینہ داری نہیں کر سکتی۔ جمیل جالبی نے نہایت مدلل انداز سے اس مفروضے کی تردید کی ہے۔^(۱۶)

جمیل جالبی نے جن الفاظ میں اس مفروضے کی تردید کی ہے وہ بھی ملاحظہ ہوں:

اردو شاعری کے سلسلے میں ایک بات بار بار کہی جاتی ہے کہ یہ دور زوال کی پیداوار ہے لیکن اس بات کو اگر تاریخی و تہذیبی تناظر میں دیکھا جائے تو اس دور کی فارسی شاعری کو تو دور زوال کی شاعری کہہ سکتے ہیں کیوں کہ یہ اُسی تہذیب کی ترجمانی کر رہی ہے جو ٹھنڈی ہو کر منجمد ہو رہی ہے۔ اردو زبان و شاعری تو اس دور میں ان نئی انقلابی، سماجی، معاشی، معاشرتی و لسانی تبدیلیوں کے ہر اول دستے کی حیثیت رکھتی ہے جو تیزی کے ساتھ بر عظیم میں پھیلنے والی ہیں۔ فارسی کے

زوال کے ساتھ ہی اردو کا رواج و عروج وہ پہلا انقلاب تھا جس کے آئینے میں آنے والے دور کا عکس دیکھا جاسکتا تھا۔ اردو زبان و ادب نے ایک طرف مرنے والی تہذیب کے سارے زندہ عناصر کو اپنے اندر جذب کر کے بر عظیم کی تہذیب کا زندہ حصہ بنا دیا اور اس طرح خود یہ زبان دو عظیم تہذیبوں کا سنگم بن کر نئی تخلیقی قوتوں کے ساتھ، ایک بدیسی زبان پر غالب آگئی۔ اور دوسری دیسی زبانوں کے لیے بھی راستہ صاف کر دیا۔ طبقہ خواص پس پشت چلا گیا۔ اور طبقہ عوام نئے خون اور نئی قوتوں کے ساتھ، اس زبان کے وسیلے سے، اس دور کی تخلیقی سرگرمیوں میں شامل ہو گیا۔ اٹھارہویں صدی عوامی قوتوں کے ابھرنے کی صدی ہے۔ اگر اردو تحریک میں عوام شریک نہ ہوتے تو اس دور زوال میں، جب عظیم مغلیہ سلطنت تیزی سے ٹوٹ رہی تھی، اس معاشرے کے تخلیقی جو ہر مردہ ہو جاتے اور انھیں بیدار کرنے میں اتنا طویل عرصہ لگتا کہ وہ آزادی جو ۱۹۴۷ء میں حاصل ہوتی، بہت لمبے عرصے کے بعد حاصل ہوئی۔ اس دور میں اٹھنے والی اس عوامی اردو تحریک نے معاشرے کی تخلیقی روح کو مردہ ہونے سے بچا لیا، اسی لیے یہ تحریک آگ کی طرح پھیلی اور ملک گیر تحریک بن گئی۔^(۱۷)

”تاریخ ادب اردو“ کی دوسری جلد، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، دو حصوں پر مشتمل ہے اور اس میں بھی جمیل جالبی نے قدم قدم پر اپنی تحقیقی سوجھ بوجھ کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ چونکہ ایک ایک حرف اور لفظ کو تحقیقی ثبوت اور پورے وثوق ساتھ لکھنا جمیل جالبی کے مزاج کا حصہ تھا اس لیے اس حصے میں بھی ہر مسئلے و موضوع کے تحت ان کا تحقیقی شعور بہت واضح ہے۔ اس جلد میں شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدائی روایت، فارسی کے ریختہ گو بیدل، شاہ گلشن وغیرہ، ولی دکنی کے اثرات، تخلیقی رویے شاعری کی پہلی تحریک: ایہام گوئی، ایہام گو شعرا، رد عمل کی تحریک، رد عمل کے شعرا۔ مظہر جان جاناں، یقین وغیرہ، رد عمل کی تحریک کی توسیع، مرزا محمد رفیع سودا اور میر محمدی بیدار وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان پر بڑی تفصیلی و تحقیقی گفتگو کی ہے۔

”تاریخ ادب اردو“ کی تیسری جلد میں بھی ان کا تحقیقی سروکار واضح ہے۔ ابتدائی دو جلدوں کی طرح اس کی بھی شروعات پیش لفظ کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس کے بعد تمہید ہے۔ یہ جلد پانچ فصلوں پر مشتمل ہے اور ہر فصل کے تحت کئی کئی ابواب بھی موجود ہیں۔ آخر کتاب میں ایک اشاریہ بھی ہے۔ جلد سوم کے پیش لفظ میں جمیل جالبی نے

نہ صرف جلد سوم کے مشتملات و مباحث پر اپنی گفتگو مرکوز کی ہے بلکہ اسے ابتدائی دو جلدوں میں بیان داستانِ زبان و ادب سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ مقدمے میں ایک جگہ لکھے ہیں:

تاریخ ادب اردو کی تیسری جلد اب آپ کے سامنے ہے۔ جو اپنی جگہ پر مکمل بھی ہے اور پچھلی جلد سے پوری طرح مربوط بھی۔ پہلی جلد آغاز سے ۱۷۵۰ء تک، اردو ادب و زبان کا احاطہ کرتی ہے۔ دوسری جلد اٹھارہویں صدی کا احاطہ کرتی ہے اور یہ تیسری جلد انیسویں صدی کے ادب و زبان کو محیط ہے۔ قارئین کرام اس بات سے ضرور واقف ہوں گے کہ انیسویں صدی تخلیقِ ادب اور رواجِ زبان کے اعتبار سے اردو کی سب سے بڑی صدی ہے۔^(۱۸)

چوں کہ جمیل جالبی انیسویں صدی کو فروغِ اردو زبان اور اس میں تخلیقیت کی وجہ سے گزشتہ تمام صدیوں میں سب سے بڑی صدی تسلیم کرتے ہیں اس لیے انھوں نے اس جلد میں اس پوری صدی کی نظم و نثر کا مطالعہ بڑی تفصیلی اور تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے مطالعے میں انھوں نے اس عہد کے حالات اور اس کی سیاسی و سماجی زندگی کو ملحوظ رکھا ہے۔ نیز اس دور کے ماحول و معاشرت اور بالخصوص انگریزی دورِ اقتدار کے زیر اثر اردو شعروادب میں ہونے والی تبدیلیوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس جلد میں اردو شاعری — محرکات و رجحانات، روایت کا سفر: کشمکش، تبدیلی، درمیانی کڑیاں، معیار سخن، قلندر بخش جرأت، مصحفی، ان شاء اللہ خاں انشا، غلام ہمدانی مصحفی، سعادت یار خان رگین، اردو نثر: فورٹ ولیم کالج، نو طرز مرصع اور فسانہ عجائب کی درمیانی کڑی، نثر رگین کا نقطہ عروج، نسخ و آتش کا دور، طرزِ جدید کی تکرار و توسیع، روایت آتش کی توسیع، تکرار اور امتزاج، شاگردانِ آتش میں مثنوی کی منفرد روایت، انیسویں صدی کی دو اہم ادبی و تہذیبی شخصیات یعنی واجد علی شاہ اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ جیسے اہم موضوعات و شخصیات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور ان پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

”تاریخ ادب اردو“ کی ابتدائی تین جلدوں کی طرح اس کی چوتھی جلد بھی کافی ضخیم ہے۔ اس کی بھی ابتدا تمہید سے ہوتی ہے اور اسے تین فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر فصل کے تحت کئی کئی ابواب اور ذیلی ابواب ہیں۔ اس جلد میں غالب، سوانح غالب، اس کی اردو شاعری و فارسی شاعری، اردو نثر نگاری، اس کی اردو و فارسی تصانیف و تالیفات، اردو غزل پر غالب کے اثرات، اس عہد کے دوسرے بڑے شعرا مثلاً شاہ نصیر، شیخ ابراہیم ذوق، مومن خان مومن، بہادر شاہ ظفر، مصطفیٰ خان شیفہ، چند اور ممتاز شعرا: روایت کی اشاعت، اردو مرثیہ سے

متعلق، اردو مرثیے کا نقطہ عروج، روایت کی تکرار: دوسرے مرثیہ گو، دور جدید کی توسیع: اردو نثر کا تنوع طنز و مزاح کی روایت وغیرہ کو موضوع تحقیق و تنقید بنایا گیا ہے۔ چون کہ یہ جلد بھی دو حصوں پر مشتمل ہے اس لیے اس کے دوسرے حصے کی شروعات انھوں نے سرسید اور ان کے رفقا سے کی ہے اور اس کا اختتام جدید شعر و ادب کے آغاز و ارتقا پر کیا ہے۔ اس حصے میں مختلف موضوعات مثلاً اردو کے عناصر خمسہ، اردو داستانیں: تمہید و مطالعہ، داستان اور ناول کا امتزاج: پنڈت رتن ناتھ سرشار، مذہبی تصانیف میں اردو نثر، تذکروں میں اردو نثر، کتب توارخ میں اردو نثر، اردو نعت گوئی کا نیا رنگ، نئی روایت: محسن کا کوروی و کرامت علی خاں شہیدی، شاعری کے دور وایتی رنگ، انیسویں صدی کا خاتمہ: امیر مینائی و مرزا داغ دہلوی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان موضوعات پر گفتگو میں بھی جمیل جالبی کے یہاں تحقیق و تنقید کا حسین امتزاج دیکھا جاسکتا ہے۔

بلاشبہ جمیل جالبی نے ان تمام کتابوں کی تحقیق و تدوین یا پھر تاریخ نگاری میں ایک ایک مسئلے پر ان کے عمیق مطالعے کے بعد کوئی رائے دی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے صرف مطبوعہ کتابوں، تذکروں، تاریخوں یا پھر شعر و ادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی تصانیف کے مطالعے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ متعدد قلمی بیاضوں اور مخطوطات کا دقت نظر سے مطالعہ کر کے ان سے براہ راست استفادہ بھی کیا اور پھر ان پر کوئی رائے دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بدولت جمیل جالبی کے تحقیق میں ایک قطعیت اور خود اعتمادی کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

ان خصوصیات کے علاوہ جمیل جالبی کی تحریروں میں موجود تحقیق و تنقید کا امتزاج بھی ان کی تحقیقات کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ کوئی بھی تنقید اس وقت تک معتبر نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں تحقیق شامل نہ ہو۔ آج اگر جمیل جالبی کی تحریروں کو اعتبار کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے تو اس کی ایک بنیادی وجہ ان میں تحقیق و تنقید کا لازم ملزوم ہونا بھی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ نگاری میں پہلی بار اگر کسی کی تحریریں اس صفت سے متصف نظر آتی ہیں تو وہ ہیں جمیل جالبی کی تحریریں۔ اس کے معترف وہ خود بھی تھے۔ چنانچہ اپنے ایک انٹرویو میں وہ کہتے ہیں:

میری تنقید میں بھی تحقیق شامل ہے۔ اس کے علاوہ میری ساری توجہ ”تاریخ ادب اردو“ پر رہی ہے جس میں قدم قدم پر تحقیق کے عمل سے تاریخ کے کام کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ تاریخ ادب اردو اس اعتبار سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں پہلی بار تحقیق و تنقید کا سماجی و تہذیبی حوالوں کے ساتھ، امتزاج ہوا ہے۔ یہ امتزاج اردو میں اس طرح پہلی بار ہوا ہے۔ تحقیق کا لفظ اور دائرہ کار میری نظر میں بہت

وسیع ہے۔ اس میں داخلی و خارجی دونوں جہتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے مثلاً اب اردو ادب کی تاریخ مختلف جزیروں کی تاریخ نہیں رہی ہے بلکہ ایک مربوط اکائی بن گئی ہے۔ گجری ادب اور دکنی ادب کی روایت کو، جس طرح تحقیق سے دریافت کیا گیا ہے، وہ یقیناً قابل توجہ ہے۔ اسی طرح روایت کے دھارے کو داخلی تحقیق کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ میں تحقیق کو تنقید کے لیے اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں جتنا تنقید کو تحقیق کے لیے۔ جب تک یہ دونوں ایک ساتھ نہیں چلیں گی اس وقت تک بڑے نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔^(۱۹)

یقیناً جمیل جالبی کی تاریخ نگاری یا پھر ان کی تحقیقی خدمات کو آج اگر کوئی حیثیت حاصل ہے تو اس کے بہت سے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ان کی تحریروں میں تحقیق و تنقید کا لازم و ملزوم ہونا بھی ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر کوئی بھی نتیجہ، نتیجہ تو ہو سکتا ہے لیکن قابل اعتبار یا نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا اور ادبی تاریخ نگاری میں تو اس کی ضرورت واہمیت اور بھی دو چند ہو جاتی ہے۔

غرض یہ کہ جمیل جالبی اردو کے ایک ایسے عظیم محقق و ناقد ہیں جن کے ادبی کارناموں اور بالخصوص تحقیقی خدمات کو ایک خاص معیار و اعتبار حاصل ہے اور پوری علمی و ادبی دنیا ان کو بنظر استحسان دیکھتی ہے۔ تحقیق میں اگرچہ کسی کی بات حرف آخر نہیں ہوتی مگر پھر بھی قارئین میں جمیل جالبی کی تحریروں کو جو اہمیت و وقعت حاصل ہے وہ، باستثنائے چند محققین کے، کم ہی لوگوں کے حصے میں آئی۔ انھوں نے جس تحقیقی انہماک، جاں فشانی اور چھان بین کے بعد ادب و تحقیق کے ان بھاری بھر کم پتھروں کو اٹھانے اور برسوں سے چلی آرہی ادبی گتھیوں کو سلجھانے میں کامیابی حاصل کی ہے اس کی مثال وہ آپ ہیں۔ دیگر علمی و ادبی کارناموں سے قطع نظر محض ادبی تاریخ نگاری میں جمیل جالبی کے یہاں جو تحقیقی و تنقیدی سروکار دیکھنے کو ملتا ہے وہ اس قدر اہم اور غیر معمولی ہے کہ اگر وہ اس کے علاوہ ادب میں کچھ اور نہ کرتے تو بھی ان کا نام ادبی تاریخ کے باب میں ہمیشہ روشن رہتا۔

حواشی

- ۱۔ مالک رام، ”اردو میں تحقیق“، مشمولہ ”اردو میں اصول تحقیق“ (منتخب مقالات)، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، (لاہور: اردو اکادمی، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۳۴
- ۲۔ جمیل جالبی، ”ادبی تحقیق“، (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۱

- ۳۔ انور سدید، ”ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید“، مشمولہ ماہ نامہ ”دائرے“، کراچی، ”گوشہ جمیل جالبی“، ۱۹۹۲ء، ص ۴۵
- ۴۔ گوہر نوشاہی، ”ڈاکٹر جمیل جالبی کا انداز تحقیق“، مشمولہ ”جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ“، مرتبین: خاور جمیل، مصطفیٰ کمال پاشا، (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء)، ص ۵۰۳
- ۵۔ وحید قریشی، ”دیوان حسن شوقی“، ایضاً، ص ۵۲۶-۵۲۷
- ۶۔ ایضاً، ص ۵۲۷
- ۷۔ ایضاً، ص ۵۲۷
- ۸۔ جمیل جالبی، ”دیوانِ نعتی“، (لاہور: مطبع قوسین، ۱۹۷۲ء)، ص ۴
- ۹۔ محمد علی اثر، ”ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق“، مشمولہ ”ارمغان“، کراچی، ”جمیل جالبی نمبر“، شمارہ اپریل تا جون ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۹
- ۱۰۔ افسر صدیقی، ”دیوانِ نعتی“، مشمولہ ”جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ“، محمولہ بالا، ص ۳۶
- ۱۱۔ غلام مصطفیٰ خاں، ”تاریخ ادب اردو کا ایک جائزہ“، مشمولہ ”ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ“، مرتبہ گوہر نوشاہی، (دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء)، ص ۳۱۵
- ۱۲۔ مشفق خواجہ، ”مثنوی کدم راؤ پدم راؤ“، مشمولہ ”جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ“، محمولہ بالا، ص ۵۱۴
- ۱۳۔ نصیر الدین ہاشمی، ”دکن میں اردو“، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۱۶ء)، ص ۶۰
- ۱۴۔ وحید قریشی، ”کدم راؤ پدم راؤ“، مشمولہ ”جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ“، محمولہ بالا، ص ۵۵-۲۵۴
- ۱۵۔ مشفق خواجہ، ”اردو ادب کی پہلی تاریخ“، ماہ نامہ ”دائرے“، کراچی، ”گوشہ جمیل جالبی“، ۱۹۹۲ء، ص ۳۵
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶
- ۱۷۔ جمیل جالبی، ”تاریخ ادب اردو“، جلد دوم، (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۷-۲۶
- ۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵
- ۱۹۔ گوہر نوشاہی، ”اردو تحقیق پر ایک مباحثہ“، مشمولہ ”جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ“، محمولہ بالا، ص ۴۶-۵۴۵

مآخذ

- ۱۔ جالبی، جمیل، ”ادبی تحقیق“، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء
- ۲۔ _____، ”دیوانِ نعتی“، لاہور: مطبع قوسین، ۱۹۷۲ء
- ۳۔ _____، ”تاریخ ادب اردو“، جلد دوم، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء
- ۴۔ خاں، غلام مصطفیٰ، ”تاریخ ادب اردو کا ایک جائزہ“، مشمولہ ”ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ“، مرتبہ گوہر نوشاہی، _____، ۱۹۹۳ء
- ۵۔ خواجہ، مشفق، ”مثنوی کدم راؤ پدم راؤ“، مشمولہ ”جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ“، مرتبہ خاور جمیل، _____، ۲۰۱۵ء
- ۶۔ رام، مالک، ”اردو میں تحقیق“، مشمولہ ”اردو میں اصول تحقیق (منتخب مقالات)“، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، لاہور: اردو اکادمی، ۲۰۱۲ء
- ۷۔ صدیقی، افسر، ”دیوانِ نعتی“، مشمولہ ”جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ“، مرتبہ خاور جمیل، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء
- ۸۔ نوشاہی، گوہر، ”ڈاکٹر جمیل جالبی کا انداز تحقیق“، _____
- ۹۔ _____، ”اردو تحقیق پر ایک مباحثہ“، _____

- ۱۰۔ قریشی، وحید، ”دیوان حسن شوقی“، _____
۱۱۔ _____، ”کدم راؤ پدم راؤ“، _____
۱۲۔ ہاشمی، نصیر الدین، ”دکن میں اردو“، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۱۶ء

رسائل و جرائد

- ۱۔ ”ارمغان“، کراچی، ”جیل جالبی نمبر“، شمارہ اپریل تا جون ۱۹۹۶ء
۲۔ ماہ نامہ ”دائرے“، کراچی، ”گوشہ جیل جالبی“، ۱۹۹۲ء

